تعلیم رسول ﷺ

حسب روایت صحیح بخاری وغیرہ حضور ﷺ پر سب سے پہلے جو قرآن مجید کی آیتیں اتریں وہ سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں تھیں جن میں سے پہلی ہی آیت میں اقراء (پڑھو) کا حکم ہے۔ جس سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ کو پہلے پڑھنے کی صلاحیت عطا کر دی گئی۔ اس کے بعد پڑھنے کا حکم ہوا۔ اور ان پانچ میں سے تیسری آیت اور چوتھی آیت پڑھیے:

اقرا وربک الاکرم الذی علم بالقلم (سورۃ الاقراء ۳-۴)

پڑھو تمہارا رب ساری بزرگیوں کا مالک ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم فرمائی۔

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ کو قلم کے ذریعے اسی جگہ قرآت کے ساتھ کتابت کی بھی تعلیم فرمائی گئی تھی اور عطائے منصب نبوت کے وقت آنحضرت ﷺ کو پڑھنے اور لکھنے دونوں کی تعلیم فرمائی گئی تھی۔ ان پانچوں آیتوں میں سے آخری یعنی پانچویں آیت ہے:

علم الانسان مالم یعلم (سورۃ الاقراء ۵)

اس انسان (کامل) کو ان (تمام باتوں کی جو منصب نبوت و رسالت و تبلیغ ارشاد کے لوازمات میں سے ہیں ان سب باتوں کی) جن کو وہ (کسی اور ذریعے سے) نہیں جان سکتے تھے تعلیم دی۔

اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ہوئی تو یقیناً دوسرے معلموں سے بہتر تعلیم ہوئی اور حضور ﷺ ہر قاری سے بہتر قاری اور ہر کاتب سے بہتر کاتب معجزانہ طور سے دفعتاً ہو گئے۔

....

الرسول النبی الامی ﷺ

سید اختر عالم٭

یاایھا الذین امنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا

وللکافرین عذاب الیم۔ (القرآن ۔ ۲:۱۰۴)

اے ایمان لانے والو! تم رسول ﷺ کو اپنی جانب مخاطب کرتے وقت لفظ "رَاعِنَا" سے مت خطاب کرو بلکہ "انظرنا" کے لفظ سے خطاب کیا کرو اور جی لگا کر ان کی باتیں سنا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب ﷺ کی شان میں اتنی احتیاط ملحوظ خاطر ہے کہ وہ اس بات کو بھی گوارا نہیں فرماتا کہ آپ ﷺ کی شان میں کوئی ذو معنی لفظ اس طرح استعمال ہو کہ اس میں گستاخی کا شائبہ پایا جائے۔ لفظ راعنا کے معنوں میں دو پہلو مذمت اور گستاخی کے نکلتے ہیں یعنی ایک معنی "اے ہمارے چرواہے" اور دوسرا "اے ہمارے بد" کے نکلتا ہے اور ایک اچھا پہلو بمعنی "اے ہمارے سرپرست" کے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے لغت عربی کے ایک مستند اور عام فہم لفظ کو رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرنے کے لیے زبان عربی سے بالکل خارج الاستعمال ہونے کا حکم صادر فرما دیا۔

یہی وجہ ہے کہ 'باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار' کا مقولہ مسلمانوں میں قبولیت کا عام درجہ رکھتا ہے اور ہمارے نعت گو شعراء مدح و ستائش میں بڑی احتیاط اور ذہنی ضبط و نظم کا اہتمام رکھتے ہیں ملاحظہ ہو عرفی کی تنبیہ:

٭ ایف ۲، ساؤتھ ۲۶/۳، بلیز تو سیفی کالونی، جناح اسکوائر، کراچی

ھشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن

نعت شہ کونین و مدیح کے و جم را

خبردار! بادشاہِ دو عالم کی شان میں نعت گوئی اور دنیاوی بادشاہوں کی مدح سرائی کے فرق سے غافل نہ ہونا۔

اللہ اکبر! احتیاط برتنے والے تو حضور اکرم ﷺ کی شان میں نعت و ثنا خوانی کے موقع پر اتنی محتاط روش کی پابندی لازم رکھیں تو پھر اس کے برعکس مواقع پر لاحق اندیشہ کے تحت ہمیں کس قدر احتیاط برتنی چاہیے۔

ان الرسول لسیف یستضاء بہ مہند من سیوف الھند مسلول

ہمارے رسول اللہ ﷺ ایک ایسی بربان قاطع تلوار کے مثل ہیں کہ جس سے ماحول میں اجالا ہی اجالا ہو جائے۔ آپ کی رفعت شان ہند (بلاد عرب کا ایک خطہ جو تلوار کی ساخت کے لیے مشہور ہے) کی جوہر دار تلواروں میں سے کھچی ہوئی ایک مصقل براں کے مثل ہے۔

حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اپنے قصیدہ کا مذکورہ شعر پڑھا تو حضور اکرم ﷺ نے اصلاح فرمائی اور اسی دم "سیوف الھند" کی جگہ "سیوف اللہ" یعنی اللہ کی تلوار پڑھنے کو ارشاد فرمایا اور اس طرح آپ نے نعت گوئی میں محتاط روش اختیار کرنے کی نشان دہی فرما دی۔

یہاں برسبیل تذکرہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا خود اپنی شان میں مدح و ستائش کے کلمات سننا اور شرف سماعت بخشنا" ورفعنا لك ذکرك "تیرے ذکر کو بلند و بالا کیا گیا) کے اعلان خداوندی کی تعبیر اور تحدیث سمجھ کر گویا استماع تشکر کی انجام دہی اور مومنوں کو صورت رسول ﷺ کی تہذیب و تربیت سے آراستہ کرنا تھا۔ اس لیے کہ انسانوں کی پیش کردہ مدح و ستائش کی کیا قیمت تھی، بمقابلہ ان ثنا خوانوں کے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی شان میں یوں نازل فرمایا ہے:

۱۔ ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی (القرآن:۵۶)

تحقیق کہ اللہ اور اسکے فرشتے اس نبی ﷺ پر درود بھیجتے رہتے ہیں۔

۲۔ وانک لعلی خلق عظیم (القرآن:۴)

اے میرے حبیب! تو ایک خلق عظیم پر فائز ہے۔

۳۔ وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین (القرآن:۱۰۷)

اے میرے حبیب! ہم نے تجھے تمام عالموں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

۴۔ انا اعطینک الکوثر (القرآن:۱)

اے میرے حبیب! ہم نے تجھے خیر کثیر عطا کیا ہے۔

۵۔ لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم۔ (القرآن:۱۲۸)

ہمارا رسول ﷺ تم ہی میں سے تمہارے پاس آ چکا ہے اس کی شفقت کا یہ عالم ہے کہ اسے تمہارا تکلیف اٹھانا شاق گزرتا ہے اسے تمہاری بہبود کا بڑا ہوکا لگا رہتا ہے اور مومنوں پر حد درجہ شفیق و مہربان ہے۔

۶۔ عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا (القرآن:۱۷:۷۹)

اے میرے حبیب! عنقریب تیرا رب تجھے مقام محمود پر فائز کرے گا۔

چنانچہ زیر نظر مضمون بھی ورفعنا لک ذکرک (تیرے ذکر کو رفعت بخشی گئی) کی تعبیر کی جانب ایک ادنیٰ کوشش ہے تاکہ لوگوں نے علم و تحقیق کے جو مغالطہ آمیز پردے بدر منیر ﷺ کی امیت (مرکزیت دوامی) پر ڈال دیے ہیں انہیں دور کر دیا جائے۔ یہ نثر کی زبان میں نعت و مدح کی ایک صنف ہے جس کی تفہیم و تدبیر کے اجر میں انشاءاللہ تعالیٰ ہم آپ کے برابر کے حقدار ہیں۔ اس ذات اقدس کے دربار میں جو کریم بھی ہے اور رؤف رحیم بھی۔

الحمد للہ، یہ ایک ایسی مہتم بالشان نعت گوئی ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے حضور فخریہ ادب کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں

اذا نحن اثنیا علیک بصالح فانت الذی نثنی وفوق الذی نثنی

جب ہم آپ کی ثنا خوانی میں کسی خوبی کو آپ سے منسوب کرتے ہیں۔ تو فی الحقیقت آپ کے صدق مجسم ہونے اور صدق و صفا کی منزل پر فائق ہونے کی مدح کرتے ہیں۔

چنانچہ مذکورہ بالا اہتمام اور تنبیہ کے باوجود اگر کوئی شخص حضور اکرم ﷺ کی شان میں بعض الفاظ قرآن کے ترجمے اس طرح کرے کہ اس لفظ کو وہ معنی قرار دے جس کے نتیجے میں وہ خلاف ادب الفاظ کے اظہار کی گرفت میں آئے تو پھر وہ یقیناً مذکورہ بالا خدائی انتباہ سے غفلت کا ثبوت دیتا ہے۔

لفظ "اُمی" کے معنی و مفہوم میں تواتر کے ساتھ لوگوں نے اپنی تحقیق و تعبیر میں جو سرسری رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ معیار حد ادب کے بالکل منافی ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ جو خدا ذو معنی لفظ کے استعمال کو حضور ﷺ کے لیے استعمال کرنے کو منع فرما رہا ہے اور لفظ راعنا کا نعم البدل انظرنا عطا فرما رہا ہے وہی لفظ امـــــی کو تین چار متبادل معنوں میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خزانہ

قدرت میں اچھے اور مناسب حال الفاظ کی کچھ کمی نہیں تھی۔

پورے کلام مجید میں لفظ الامی دو جگہوں پر اور اس کی جمع الامیون چار جگہوں پر استعمال ہوئی ہے۔ ہمارے ترجمہ کرنے والوں نے جہاں حضور ﷺ کے لیے امی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں کچھ اور ترجمہ کیا ہے اور جہاں اس کی جمع الامیون دوسرے لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے وہاں کچھ اور ترجمہ کیا ہے۔ یہ ذہنی ہچکچاہٹ اور تذبذب اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ اس ترجمہ سے خود مطمئن نہیں اور تحت شعور میں پاس ادب کی کسک محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں دو جگہ اور یوں سمجھیں کہ پورے قرآن شریف میں حضور اکرم ﷺ کے لیے دو مرتبہ الامی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بچارے مترجمین اس کا ترجمہ نہیں کرتے صرف نبی امی اور نبی امی نقل کرتے رہے ہیں (اس لیے کہ ان کے ذوق سلیم اور فطری جذبۂ احترام کو اس بات سے ٹھیس لگتی ہے کہ وہ ان پڑھ بغیر لکھے پڑھے یا اس طرح کے کچھ اور لفظ ترجمہ میں لکھیں) لیکن دوسرے چار مقامات پر جہاں اس لفظ کی جمع امیون استعمال ہوئی ہے۔ وہاں وہ ترجموں میں "ان پڑھوں" اور جاہلوں کا لفظ استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ حال تو اردو کے ترجموں کا ہے۔ انگریزی ترجموں میں جہاں حضور ﷺ کا ذکر آتا ہے تو وہاں پر اس کا ترجمہ (Unlettered) کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے لیے (Illiterate) کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایک ہی لفظ کے ترجمہ کے لیے دو الگ الگ انگریزی کے الفاظ کا انتخاب فرق مراتب قائم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جو مزید ثبوت اس بات کا ہے کہ مترجم خود ذہنی طور پر مطمئن نہیں ہے اور مجبوراً ادھر ادھر کے الفاظ تلاش کرتا ہے تاکہ حضور ﷺ کی شان کے شایان کوئی لفظ اسے کوئی مل جائے۔ مگر وہ کامیاب اس لیے نہیں ہیں کہ انہوں نے اس خدائی اہتمام کو پیش نظر نہیں رکھا کہ خدا تعالیٰ اپنے محبوب رسول ﷺ کے لیے عربی لغت کا کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا پسند نہیں فرماتا، جو ذو معنی ہو اور اس کے حبیب ﷺ کی شان کے منافی ہو۔ نمونہ کے طور پر ایک مفسر قرآن کی تشریح بابت لفظ امی ملاحظہ ہو۔

''امی کے معنی مادرزاد کے ہیں اور ان پڑھ جاہل کو کہا کرتے ہیں یہ امر اگرچہ لوگوں کے واسطے عیب ہے۔ مگر حضرت رسول ﷺ کے واسطے ہنر تھا۔ کہ دوسرے لوگوں سے بغیر علم حاصل کیے وحی، الہام اور علم لدنی کے ذریعہ علوم اولین و آخرین پر حاوی اور لکھنا پڑھنا سب کچھ جانتے تھے (تفسیر قرآن از مولانا سید فرمان علی صفحہ نمبر ۲۷۰، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ)''۔

اہل تدبیر کی واماندگیاں

آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

لیکن کیا وحی، الہام، علم لدنی اور علوم اولین و آخرین ایسے حقائق و علوم ہیں کہ ان کے فرمان کے بموجب دوسرے لوگوں سے حاصل کیے جاسکیں؟

مفسرین اور مترجمین کی یہ ساری ذہنی الجھنیں اور معکوس ذہنی وراثیں رفع ہو جائیں اگر وہ اولاً اللہ تعالیٰ کی مندرجہ ذیل تنبیہ سے سہو و تغافل اختیار نہ کرتے:

ولا تقف ما ليس لك به علم ان السمع والبصر والفؤاد كل

اولئك كان عنه مسئولا۔ (القرآن: ۳۶)

جس چیز کی بابت تمہیں علم نہ ہو تم اس میں ظن اور قیاس کی ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ خبردار کہ تم اس بات کے لیے جواب دار بنائے گئے ہو کہ تم نے اپنی سمع، بصر اور فؤاد کی عطا کردہ صلاحیتوں سے کس طرح کام لیا۔

دوم یہ کہ اگر تصریف آیات (ان يزداد فيه ويحسن) یعنی لفظی اور معنوی لحاظ سے اضافہ اور حسن پیدا کیے جانے کی بابت اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں سات مقامات پر یعنی سورۃ الاسراء کی آیت نمبر ۴۱ اور ۸۹ میں سورۃ الکہف کی آیت نمبر ۵۴ میں سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۴۶، ۶۵، ۱۰۵ میں اور سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۵۸ میں جس اہمیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اس کو ملحوظ خاطر رکھتے، یا پھر اصول تفسیر کے سلسلے میں خود اپنے اس قول کو سامنے رکھتے کہ فان القرآن يفسر بعضه بعضا (قرآن کی بعض آیات کی تفسیر بعض آیات خود کرتی ہیں) تو پھر انہیں اس علمی قباحت سے نجات مل جاتی۔ پورا قرآن شریف پڑھا جائے۔ کہیں سے بھی اس بات کا کوئی شائبہ نہیں ملتا کہ حضور اکرم ﷺ کے تدریسی علم اور کتاب مخطوطی و ملفوظی کی اکتسابی تعلیم کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی موضوع بحث قائم کیا ہو اس پر کچھ کلام فرمایا ہو حضور اکرم ﷺ کے علم تدریسی و اکتسابی سے ناواقفیت کو وجہ افتخار ثابت کیا ہو یا خود اپنی ذات بابرکات کے لیے کوئی ستائش کا پہلو اس کی بابت ظاہر کیا ہو کہ حضور ﷺ کو تقدیر الٰہی کے تحت علم تدریسی سے محروم رکھا گیا تاکہ علم لدنی کے معجزات کا ظہور ذات اقدس ﷺ سے کرایا جائے۔

غالباً مفسرین کو سورۃ العنکبوت کی آیت نمبر ۴۸ سے یہ جواز فراہم کرنے کا مغالطہ ہوا ہے کہ وہ حضور ﷺ کی مروجہ علوم اکتسابی سے لاعلمی کو ایک مستقل موضوع بحث بنا کر پیش کریں۔ آیت مذکورہ یہ ہے:

وما كنت تتلوا من قبله من كتاب ولا تخطه بيمينك

اذا لا رتاب المبطلون۔ (القرآن: ۴۸)

اے رسول ﷺ اس سے قبل نہ تو تم نے کسی کتاب کا مطالعہ اور اس کی عملی متابعت کی ہے اور نہ کسی تصنیف

وظائف کے سلسلے میں مشغول رہے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ حق کو باطل قرار دینے والا گروہ اور بھی شک و

گمراہی میں مبتلا ہو جاتا۔

حالانکہ مذکورہ بالا آیت اس امر کو موضوع بحث نہیں بناتی کہ حضور ﷺ نوشت و خواند سے نا آشنا تھے۔ بلکہ یہ تو مخالفین کے ان الزامات کا جامع جواب تھا جو وہ قرآن کو مبنی بر وحی اور منزل من اللہ نہ ماننے کی صورت میں کیا کرتے تھے مثلاً۔

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلا۔ قل انزلہ الذی یعلم السر فی السموت والارض ۔(القرآن:۵)

انھوں نے کہا کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں جن کو محمد ﷺ نے قلم بند کیا ہے اور یا صبح و شام انہیں املا (Dictation) کرا دیا جاتا ہے کہو کہ ایسا نہیں بلکہ اسے تو اس علیم ہستی نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے اسرار و رموز کو جانتا ہے۔

ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر ، لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین (القرآن:۱۰۳)

اور ہمیں علم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کو کوئی بشر (ذرہ برابر کوئی ثبوت، بعض عیسائی مصنفوں کے اس الزام کی حمایت میں نہیں ملتا کہ محمد ﷺ پر نازل شدہ وحی کے بیشتر حصے ایک عیسائی راہب کے مرہون منت ہیں یعنی اس کے تعلیم کردہ ہیں۔ Palmer, The Quran, Intr. Page XlVIII) قرآن تعلیم کر جایا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ جس شخص کی بابت تعریفیں پیش کر رہے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور قرآن کی زبان خالص اور صاف عربی ہے۔

ثم لم تولو عنہ وقالو معلم مجنون ط (القرآن:۱۴)

پھر محمد ﷺ سے روگردانی کی اور کہنے لگے یہ تو کوئی سکھایا پڑھایا ہوا جنونی آدمی ہے۔

وقال الذین کفروا ان ھذا الا افک ن افتراہ و اعانہ علیہ قوم اخرون ۔ (القرآن:۴)

اور کافروں نے کہا محمد ﷺ پر نازل شدہ تعلیمات محض ایک من گھڑت باتیں ہیں۔ اس افترا میں کوئی گروہ ان کی در پردہ اعانت کر رہا ہے۔

حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک طرف کفار و مشرکین کو یہ اصرار ہے کہ حضور ﷺ جو کچھ تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ ان کی اکتسابی اور تحصیل کردہ علم کی بنا پر ہے بلکہ قرآن حضور اکرم ﷺ کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب ہے دوسری طرف اللہ تعالیٰ یہ تردید فرما رہا ہے کہ محمد ﷺ کی

دعوت کسی علمی سرقہ یا مخفی استادوں کے ذریعے سکھائے پڑھائے ہوئے علوم پر مبنی نہیں ہے بلکہ میری جانب سے ان کی شان مصطفائی و مجتبائی کے بموجب وحی کردہ اور الہامی ہے تیسری طرف ہمارے مفسرین نے حضور ﷺ کی نوشت و خواند کی بحث چھیڑ کر اپنی جانب سے ایک منفی اعزاز (Negative Honour) بے پڑھے لکھے، ہونے کا بخشنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں وہ اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ مذکورہ بالا آیتوں میں مخالفین اسلام نے حضور ﷺ کی دعوت دین اور اس کے علمی ماخذ اور اساس پر اعتراضات وارد کیے ہیں نہ کہ صلاحیت نوشت و خواند کو موضوع بحث بنایا ہے۔

انھوں نے اس منفی اعزاز بخشی کے لیے صرف سورۃ العنکبوت کی مذکورہ آیت (نہ تو تم نے اس سے پہلے کسی کتاب کی پیروی کی اور نہ ہی تمہارے ہاتھ کسی تصنیف و تالیف میں مصروف تھے یا فن تحریر سے آشنا تھے) ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تجاوز کی انتہا کر دی کہ اپنے اس وضاحتی موضوع کو جو کفریہ پروپیگنڈوں اور خدائی جوابات کے تقابل و تناظر میں مخفی درجہ رکھتا ہے اور تاویل احسن (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تاویل طلب مواقع سے نمٹنے کے لیے مومنین کو یہ خوش خبری دی ہے کہ وہ خود تاویل احسن فراہم کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے: ولا یاتونک بمثل الا جئنٰک بالحق و احسن تفسیرا (اور یہ مخالفین تمہارے پاس کوئی مثال لے کر نہیں آتے کہ ہم تمہیں حق اور اس کی احسن تفسیر عطا کر دیتے ہیں۔ (۲۳:۲۵)) کا محتاج ہے، اسے مستحکم دلائل بخشنے کے لیے لفظ امی کو بھی "ان پڑھ اور جاہل" کا معنی دے کر اس کی شاندار معنویت کو پامال کرنا شروع کر دیا۔

واضح ہو کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو لفظ "مجید" کی صفت سے شرف بخشا ہے اور اس کے معنی بزرگ و با مرتبہ (مجید) اس مفہوم میں ہے کہ یہ کتاب صحت لفظی، ترکیبی اور معنوی میں یکتا ہے اور بلاغت آفرینی میں اس درجہ کمال کی حامل ہے کہ اس کی صداقت، بابت اس کے دعویٰ کے تبیانا لکل شی (ہر شے کے لیے واضح بیان) کسی خارجی عوامل کی محتاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی لغت میں اس اونٹ کی بابت جو شکم سیر ہو کر کسی قسم کی طلب و احتیاج سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے:

مجدت الابل

اونٹ سر سبز چراگاہ میں خوب شکم سیر ہو گیا۔

چنانچہ قرآن اپنی بلاغت اور شان استغنا کا ایک اولیٰ بنیادی ثبوت یہ بھی پیش کرتا ہے کہ جس کسی مقام پر کسی مفہوم کی ادائیگی کے لیے لغت عربی میں کئی ایک متبادل الفاظ ملتے ہیں وہاں وہ اسی لفظ کا انتخاب کرتا ہے جو منفی و ذو معنویت سے پاک ہو اور مثبت ذو معنویت اور بلاغت کا حامل ہو۔ اس حقیقت کو

اگر پیش نظر رکھا جائے تو ہمیں ولا تخطه بیمینك (۲۹:۴۸) والی آیت میں یہ معنی نکالنے سے کہ حضور ﷺ کے دست مبارک نوشت و تحریر سے نابلد تھے، اجتناب برتنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ کا محض یہ فرمانا کہ اے محمد ﷺ اس سے قبل تم کسی تصنیف و تالیف میں مشغول نہیں رہے، اس مفہوم کو کب لازم قرار دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی اس صلاحیت کی حتمی نفی فرما رہا ہے۔ آپ کی صلاحیت نوشت و تحریر کی بابت جہاں قرآن خاموش ہو، نہ تو نفی کرتا ہو اور نہ اثبات، وہاں ہماری جانب سے صراحتاً نفی کرنا بڑی جسارت کی بات ہے۔

اگر لفظ تخط اور یمین کی معنوی گہرائیوں پر نظر ڈالی جائے تو یہ بجائے نقص و کمی کے وصف و ایجاب کا مفہوم عطا کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں اس کے لغوی معنی اور شوکت مفہوم:

خط الخطة لنفسه . اتخذها واعلم عليها

کسی خطہ زمین پر قابض ہونا اور اس پر اپنا جھنڈا گاڑنا

خط الرياح الرمل. جعلت فيه طرائق مستطيلة

تندو تیز ہوا کا ریت کے ٹیلوں میں سے مستطیل راستے نکال دینا۔

فلان يخط في الارض . يفكر في امره

کسی شخص کا اپنے مسائل پر غور و فکر کرنا

خط البلاد . جعل لها حدودا

ملک کی سرحد بندی کرنا، حدود متعین کرنا

اب یمین (داہنا ہاتھ) کی معنویت ملاحظہ ہو

یمین ۔ برکت، قوت، قدرت

يمن الله فلانا . جعله مباركا

فلاں شخص کو اللہ نے مبارک بنایا

يمن لقومه على قومه. كان مباركا عليهم

اپنی قوم کے لیے مبارک ثابت ہوا۔

قرآن شریف نے بھی لفظ یمین کو قدرت، طاقت، شان اور رعب و دبدبہ کے مفہوم میں، ان آیتوں میں استعمال کیا ہے۔

فراغ عليهم ضربا باليمين ۔ (۹۳:۳۷)

پھر ابراہیم علیہ السلام جھکے بتوں پر اور زور دار ضرب (ہاتھ) لگانے کے لیے

قالوا انكم كنتم تاتوننا عن اليمين (القرآن:۲۸)

جز امرا والے دن نیکوکار کہیں گے بدکاروں سے اچھا آپ وہی ہیں جو ہم سے دنیا میں بڑی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ سے پیش آیا کرتے تھے۔

لکھنے لکھانے کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے زبان عربی میں کتب، سطر اور رسم بھی آتا ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی شان میں مذکورہ کوئی لفظ استعمال نہیں فرمایا اور ایک مقام پر تخط کہہ کر حضور ﷺ کے لکھنے لکھانے کا تذکرہ بھی فرمایا تو لفظ کو ایک ایسی شان امتیازی بخشی کہ پورے قرآن میں دوسری مرتبہ اس لفظ کا استعمال قطعاً نہیں ہوا۔ بات واضح ہے اور اس کی تشریح کو آپ نے ان دونوں لفظوں خط اور یمین کے مذکورہ بالا پر شوکت معنی اور لغوی معنویت میں خود ملاحظہ فرمالیا۔ یعنی یہ کہ فلان يخط في الارض کے معنی فلان يفكر في امره (فلاں شخص اپنے مسائل پر غور و فکر کرتا ہے اور ذہنی کاوشوں سے کام لیتا ہے) کی مثال لغت عربی سے گزشتہ سطور میں پیش کی گئی، اس کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کرلیں کہ کیا حضور ﷺ دعوت دین کے سلسلے میں جن دشواریوں اور مزاحمتوں سے گزر رہے تھے اور کی دور کے جن مسائل سے دوچار تھے خواہ وہ دور ابتدائی دنوں میں پوشیدہ اور خفیہ دعوت دین کا ہو یا اعلانیہ دعوت دین کے آغاز کا ہو یا ظہور نبوت سے پہلے غار حرا اور دوسرے غاروں میں جا جا کر اعتکاف اور مراقبہ و مکاشفہ کا دور ہو کیا ان تمام احوال و ایام کے دوران میں حضور اکرم ﷺ فکری کاوشوں اور شدید قلبی بے چینیوں کی کیفیت سے نہیں گزر رہے تھے؟ اگر گزر رہے تھے تو آپ اپنی فکری کاوشوں کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر سکتے تھے یا کرا سکتے تھے اور اسے بھی تحریری صحیفہ اور افکار نوشتہ کی صورت میں مخاطبین کے سامنے پیش کر سکتے تھے لیکن آپ نے باوجود شدید فکری اضطراب اور قلبی رنج و کوفت کے ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اسی طرف اشارہ فرما رہا ہے کہ اے میرے حبیب اگر تیرے دست مبارک نے اگر تیری فکری کاوشوں کو تحریری صحیفہ کی صورت میں پیش کیا ہوتا تو یہ لوگ اور بھی شک و شبہ میں گرفتار ہو جاتے۔

اگر کسی صاحب کو یہ گمان ہو کہ پہلی وحی نازل ہونے سے قبل حضور ﷺ کا حساس قلب اپنے ماحول سے غیر متعلق تھا اور آپ ﷺ چین اور پرسکون کی زندگی گزار رہے تھے تو وہ بڑی بھول میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ کی اس قلبی بے چینی کا کیسا علم تھا۔۔۔۔ مندرجہ ذیل آیتوں کے پیار بھرے کلمات اس کی گواہی خود پیش کر رہے ہیں۔

الم نشرح لک صدرك ووضعنا عنک وزرك الذی انقض ظهرك (۹۴:۱)

کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہیں کر دیا اور تم پر سے وہ بوجھ نہیں اتار دیا جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔

لعلک باخع نفسک الا یکونو مومنین (۲۶:۳)

شاید تم مارے افسوس کے اپنی جان دے ڈالو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

فلعلک باخع نفسک علی آثار ھم ان لم یومنو بھذا الحدیث اسفا (۱۸:۶)

اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو شاید تم مارے افسوس کے ان کے پیچھے اپنی جان دے ڈالو گے۔

چنانچہ خط اور یمین کی جو لغوی تشریحات اس سے پہلے پیش کی گئیں، ان کی روشنی میں ہم وما کنت تتلو من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون (۲۹:۴۸) والی آیت کے فقرہ ولا تخطہ بیمینک کا متبادل ترجمان متبادل الفاظ میں کر سکتے ہیں:

۱۔ اور نہ تو اپنے فکری مسائل کی عقدہ کشائی میں تیرے دست قدرت نے کسی تحریری کاوش سے کام لیا۔

۲۔ اور نہ تو تیرے دست قدرت نے تیری فکری کاوشوں کا کوئی صحیفہ تحریر پیش کیا۔

۳۔ اور نہ تو تیرے دست قدرت نے تیرے فکری تعمق کا کوئی نوشتہ پیش کیا۔

واضح ہو کہ کلام مجید کتاب کے استعمال کے ساتھ کسی کتاب کی کتابت کا مفہوم ادا کرنے کے لیے ہمیشہ خط کی جگہ کتب کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کتب کے سلسلے میں کتابت کرنے والے ہاتھ کے لیے یمین کی جگہ (ید کی جمع بمعنی ہاتھ) کا لفظ استعمال کرتا ہے:

من عند اللہ (القرآن ۲:۷۹)

یہود اور نصاریٰ اپنے ہاتھوں (اید) سے کتاب کی کتابت کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ کی صلاحیت کتابت اور نوشت و تحریر کی بابت ہے اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے جسے ہمارے مفسرین اور مترجمین تواتر کے ساتھ پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن شریف کی عبارت شاید یوں ہوتی:

ولا تکتبه بیدك

لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کلام مجید نے اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لیے اور حضور اکرم ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے لفظ تکتبه اور ید کو ترک کر کے لفظ تخطہ اور یمین انتخاب فرمایا اور اس بلیغ و عظیم مفہوم کو حد درجہ وقیع اور محتشم بالشان بنائے رکھنے کے لیے پورے کلام مجید میں کسی اور موقع پر یا کسی

اور فرد و بشر یا نبی کے لیے استعمال نہیں فرمایا۔

چنانچہ مذکورہ بالا آیت (۴۸:۲۹) جن مخالفین حق کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ان کا مجرمانہ ضمیر اس کا براہ راست مفہوم سمجھ رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ ان ہی کی شان میں ایک ہجو بلیغ تھی۔

واضح ہو کہ تلبیس آمیز یہودیت اور تحریف شدہ عیسائیت کے علم برداروں کا یہ خاصہ تھا کہ الہامی کتابوں کی متابعت کے جھوٹے دعووں کے ساتھ اپنی طرف سے تصنیف و تالیف کے انبار لگاتے چلے جارہے تھے اور اس جرم کا الزام اپنے آئینہ کردار کی روشنی میں الٹا حضور ﷺ پر عائد کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کی اس اجتماعی بدکرداری (انجیل کی تحریف کس وسیع پیمانے پر کی گئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مل (Dr. Mill) کی تحقیق کے مطابق اس کے تیس ہزار نسخے اور ڈاکٹر گرسباخ (Dr. Griesbach) جنہوں نے اپنی عمر کے تیس سال اس تحقیق میں صرف کیے ان کے حساب سے انجیل کے تین لاکھ نسخے ایسے ہیں جو باہم متضاد اور مختلف ہیں۔ ملاحظہ ہو پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی کتاب۔ (What is Christianity) صفحہ نمبر ۵۱)) کی روشنی میں خدائے علیم و خبیر نے اس آیت کے ذریعہ یہ بتایا کہ تمہاری طرح نہ تو محمد ﷺ کسی سابقہ کتاب آسمانی کی متابعت کے دعویدار تھے اور نہ ہی اس دعویٰ کو بنیاد بنا کر اپنی جانب سے علمی سرقہ یا تحریف و تلبیس (نعوذ باللہ) کے ذریعہ کسی تصنیف و تالیف کی قدرت و مہارت پیش کر رہے ہیں۔ اگر محمد ﷺ ایسا کرتے، تو تم حق کو باطل اور باطل کو حق بنانے کے فن میں ماہر ہو اور جس کا فرد مشرک قوم میں بھی اپنی دعوت پیش کرنے گئے ان ہی کی ضلالتوں اور گمراہیوں کا لبادہ اوڑھ کر اشتراک عمل میں مصروف ہو گئے تو پھر محمد ﷺ پر نازل کردہ حقیقۃ الحقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے اور انہیں بھی اپنے ہی جیسا سمجھ بیٹھتے۔

اتنی عظیم تنقیدی معنویت کو چھوڑ کر ہم نے یہ سطحی معنی وضع کر لیے کہ حضور ﷺ کے دست مبارک نوشت و تحریر سے عاری تھے (اور اللہ تعالیٰ اس آیت میں ہمیں خاص طور پر اسی بات سے آگاہ کرنا چاہتا ہے) ایسی بے محل بات جس کا نفس مضمون اور موضوع بحث سے کوئی ربط نہ ہو فکری الجھاؤ کے مریض ہی کر سکتے ہیں۔

لفظ امی کے لغوی و اصطلاحی معنوں اور قرآنی آیات پر مبنی دلائل کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ذرا اس پہلو پر غور فرمائیں کہ کیا کوئی خالق اپنی مخلوقات کی جبلی اور فطری صلاحیتوں کی بابت جو اس نے اس کی سرشت اور بنیاد تعمیر میں ہی ودیعت کر دی ہیں کبھی اس قسم کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھے گا کہ اس کی قوت صناعی اور تخلیقی پر حرف آئے۔ مثلاً کیا کوئی طیارہ سازی کا انجینئر یہ مضحکہ خیز بات زبان پر لائے گا کہ

دیکھو میرے طیارے کی اڑان، حالانکہ اس نے کسی پرندے سے پرواز کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اسی طرح کیا کمپیوٹر مشین کا موجد ایسی مضحکہ خیز بات کرسکتا ہے کہ دیکھو اس مشین نے نہ تو کسی سے گنتی اور پہاڑا سیکھا، نہ جمع تفریق اور ضرب تقسیم سیکھی، لیکن یہ بڑے سے بڑے تجارتی ادارے کا بجٹ اور اکاؤنٹ تک آڈٹ کر لیتا ہے کیا آج تک کسی عاقل انسان نے بطخ کے نوزائیدہ بچے کو پانی میں داخل ہوتے ہی تیرتا دیکھ کر کبھی یہ سوال بھی کیا کہ اس بچے نے انڈے سے نکلتے ہی تیرنا کس طرح سیکھ لیا؟ اگر نہیں تو پھر حضور ﷺ کی مخطوطی اور مکتوبی علم سے یقینی کردہ نا آشنائی کو موضوع بحث بنانا کس درجہ مضحکہ خیز ہے۔ وہ ذات اقدس جو سراپا علم ہی علم ہے اور بعد خدا مبداء و منتہا ہے تمام علوم کا اس ذات پاک ﷺ کی بابت یہ موضوعات قائم کرنا دراصل حقیقت وجود محمد ﷺ سے بے خبری یا اعراض ہی ہوسکتا ہے۔

حالانکہ ہمارے مفسرین اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور محمد ﷺ کے درمیان تعلیم قرآن مجموعی کے سلسلے میں کوئی درمیانی واسطہ نہیں ہے۔ خود اللہ ہی نے پورا کا پورا قرآن جو تمام علوم جزئی وکلی پر محیط ہے اور کوئی رطب و یابس اس کے احاطۂ علمی سے باہر نہیں۔ محمد ﷺ کو بہت پہلے اس سے کہ انسان کو خلق کیا اور اسے علم بیان تعلیم کیا فطرۃً تمام علوم جزوی وکلی ودیعت کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بمقتضائے سرشتِ محمدی ﷺ، بر بنائے صفات مجتبائی و مصطفائی حقیقت وجود محمد ﷺ کو معلم پہ قرآن مجموعی وکلی اسی لمحہ کر دیا تھا جسے عارفان حق نزول اول از مقام احدیت سے تعبیر فرماتے ہیں۔

واضح ہو کہ تعلیم قرآن اور تنزیل قرآن میں فرق تمیزی لازم ہے ورنہ یہ نکتہ ناقابل فہم ہی رہے گا۔ تعلیم قرآن آناً فاناً اور جملہ طور پر قلب محمد ﷺ اور وجود محمد ﷺ پر ہوئی اور تنزیل قرآن بواسطہ جبرئیل امین نجماً نجماً اور وقتاً فوقتاً حالات نزول کے تحت ہوتی رہی، یہ مذکورہ حقائق مندرجہ ذیل آیات قرآنی اور حدیث میں مضمر ہیں:

۱۔ الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان۔(۱:۵۵)

الرحمن نے پورے کا پورا قرآن تعلیم فرمایا۔ پھر انسانوں کو خلق کیا اور پھر اسے بیان وتوضیح کی تعلیم وصلاحیت ودیعت کی۔

۲۔ فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ(۲:۹۷)

بے شک جبرئیل امین نے اذن الٰہی سے تیرے قلب پر وقتاً فوقتاً قرآن کی تنزیل کی۔

۳۔ ان علینا جمعہ و قرانہ فاذا قرأنا فاتبع قرانہ ثم علینا بیانہ۔(۱۷:۷۵)

یقیناً جس طرح پورے کا پورا قرآن جمع کر دینا ہمارے ذمہ ہے اسی طرح اس کا پڑھوا دینا بھی تو پھر ہم

جبرئیل امین کی زبانی جتنا کچھ سنا دیں، تم بھی اتنا ہی لوگوں کو سنا دو، پھر تمہارے لیے ان کے مطالب کی وضاحت بھی میرے ہی ذمہ ہے۔

۴۔ کنت نبیا و آدم بین الماء والطین (الحدیث)

میں اس وقت بھی مقام نبوت پر فائز تھا جب کہ آدم ابھی آب وگل کے تخلیقی مراحل سے گزر رہے تھے۔

حقیقت وجود محمد ﷺ سے متعلق مندرجہ بالا اشارات کچھ وضاحت طلب ہیں چنانچہ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ علیم بالذات ہے اور علیم بالذات جاہل لذات کو محبوب نہیں رکھتا۔ کامل کمال کو اور جمیل جمال کو پسند کرتا ہے، اللہ جمیل و یحب الجمال (اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے) لہٰذا اس نے نبیوں کو نہ صرف یہ کہ غیر عالم اور جاہل پیدا نہیں کیا بلکہ علم ان کی سرشت میں ودیعت کیا اور اول چیز جو صفات الٰہیہ میں سے مقام احدیت سے متنزل ہوئی ہے وہ علم ہی ہے۔

الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان ط

الرحمن نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو خلق کیا اور اس کو بیان سکھایا۔

اس آیت میں تعلیم قرآن کا ذکر مقدم ہے، انسان کی تخلیق پر۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے الرحمن فرمایا ہے ''اللہ'' نہیں فرمایا ہے اور خلقت انسان سے پہلے تعلیم قرآن کا ذکر کیا ہے تو پھر وہ تعلیم حاصل کرنے والا معلم کون ہے جس کو خلقت انسانی کی تخلیق سے پہلے ہی القرآن (پورے کا پورا قرآن) تعلیم کر دیا گیا تھا؟

اللہ اسم باری تعالیٰ ہے باعتبار جامع ہونے جملہ صفات کمالیہ کے ''الرحمن'' اسم ہے باعتبار ظہور ان جملہ صفات کمالیہ کے جو اسم اللہ میں مضمر ہیں کیونکہ رحمت ہی سے ظہور ہوتا ہے۔

ورحمتی وسعت کل شی۔ (الاعراف:۱۵۶)

ہماری رحمت ہر شے پر وسیع اور محیط ہے

اور تعلیم مقام ظہور ہے اس لیے الرحمن فرمایا، اللہ نہیں اسی لیے جہاں کہیں کلام مجید میں صفات علم الٰہی کا ذکر آتا ہے وہاں الرحمن اور رحمت ہی استعمال ہوتا ہے مثلاً عالم الغیب والشہادۃ ھو الرحمن الرحیم (۲۲:۵۹) اور ربنا وسعت کل شی رحمۃ و علما (۴۰:۷)

چنانچہ وہ معلم جسے قبل انسانی القرآن کی تعلیم کلی دی گئی وہ حقیقت نورانیہ محمد ﷺ ہی ہے کیونکہ آپ اول موجودات ہیں۔ بموجب اس حدیث کے اول ما خلق اللہ نوری (سب سے پہلے جو چیز اللہ نے خلق کی وہ میرا نور ہے) اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اول اول جو چیز مقام احدیت سے

منزل ہوئی وہ علم ہے۔ لہٰذا حقیقت نورانیہ محمدیہ فی نفسہٖ حقیقت علیہ ہے۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ یہ تعلیم القرآن زمان ومکان کے لحاظ سے تعلیم عالم عنصری وارضی نہیں ہے بلکہ تعلیم ایجادی ہے۔

یعنی مبدء فیاض باری تعالیٰ نے اول اول قوت علیہ ایجادی کی جو حقیقت نورانیہ محمدیہ ﷺ ہے۔

اس حقیقت کا ثبوت کہ انبیاء کرام کی تعلیم تعلیم ایجادی ہے اور ایجاد و تعلیم دونوں ایک ہی آن واحد میں ہیں اور یہ کہ ان کی تعلیم، تعلیم تدریجی یا اکتسابی نہیں، قصہ آدم کے اس جز میں واضح طور پر درج ہے۔

۱۔ واذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سجدین۔ (۲۹:۱۵)

جب میں آدم علیہ السلام کے پتلے کو درست اور معتدل بنالوں اور اپنی روح خاص اس میں پھونک دوں تو تم سارے فرشتے اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ۔

۲۔ وعلم آدم الاسماء کلھا (۳۱:۲)

اور پھر آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام اسماء کی حقیقت تعلیم کردی۔

چنانچہ یہ تعلیم حضرت آدم علیہ السلام محض نفخ روح ہی سے ہوا نہ یہ کہ پہلے ان کو خلق کیا گیا پھر روح پھونکی گئی اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ان کو تعلیم دی گئی۔ بلکہ ایجاد آدم، نفخ روح اور تعلیم بیک وقت اور ایک ہی آن واحد میں ہوئی یعنی ان کو عالم پیدا کیا گیا اور وہ اپنی سرشت وجود میں ہی علم ویقین سے نوازے گئے اور وہ روح تھی، روح علمی ہے جو ان کو دی گئی اور جس کے داخل ہوتے ہی وہ عالم ہو گئے۔

دوسرا ثبوت میثاق ارواح کے واقعہ میں ملتا ہے۔ جب عالم ارواح کے تمام نفوس سے اللہ تعالیٰ نے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ تو سب روحوں نے بیک آواز جواب دیا، ہاں کیوں نہیں (واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالو بلی۔ (۱۷۲:۷) ظاہر ہے کہ جب تک عرفان حق ان روحوں کے وجود وسرشت میں اور ان کی فطرت و جبلت میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم نہیں کی تھی ان کا جواب اثبات میں دینا اور اپنے نفسوں کو خود پر گواہ بنانا محال عقلی تھی۔

تیسری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس حالت طفولیت کی ہے کہ جب وہ آغوش مادر میں تھے اور گہوارہ کی زینت تھے اسی وقت وہ لوگوں سے سوال و جواب میں پورے علم اور وثوق کے ساتھ مشغول تھے۔

فاشارت الیہ قالو کیف نکلم من کان فی المھد صبیا قال انی عبد اللہ اتنی الکتاب وجعلنی نبیاً و جعلنی مبارکا این ما کنت و او صانی بالصلوۃ والزکوۃ ما دمت حیاً

وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا والسلام علی یوم ولدت و یوم اموت ویوم ابعث حیا۔ (۲۹:۱۹ تا ۳۳)

تو مریم نے اپنے شیر خوار بچے کی طرف اشارہ کیا اس پر وہ لوگ بولے کہ بھلا ہم لوگ گود کے بچے سے کس طرح گفتگو کریں۔ جب عیسیٰ علیہ السلام بول پڑے، بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اسی نے مجھ کو کتاب عطا کی، مجھ کو نبی بنایا اور چاہے میں جہاں رہوں مجھ کو مبارک بنایا اور جب تک میں زندہ ہوں مجھ کو نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہے اور مجھے اپنی والدی کا فرمان بردار بنایا اور مجھے سرکش و نافرمان نہیں بنایا اور جس دن مجھے پیدا کیا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن دوبارہ زندہ کھڑا کیا جاؤں گا۔ خدا کی طرف سے مجھ پر سلام ہی سلام ہے۔

مذکورہ بالا آیات وتشریحات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ جو شے مصدر علم یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانی سے ظہور پذیر ہوئی وہ حقیقت نورانیہ علیہ محمدیہ ﷺ ہے جو کل موجودات روحانی و نفسانی، نورانی وظلماتی اور علوی وسفلی کے احوال، ان کی کیفیات وکمیات اور حقائق ودقائق پر حاوی ہے۔ ﷺ لہٰذا ایسی ذات بابرکات کے سلسلہ میں علم وجہل اور خواندگی وناخواندگی کے موضوعات قائم کرنا اور بے سوچے سمجھے لفظ "الامی" کو بھی جو اپنے اندر معنویت کا ایک عظیم اور باشان عالم سموئے ہوئے ہے، پڑھے اور ان پڑھے کی بحث میں ملوث کرنا ظلم صریح ہے۔

(یہ مضمون سید اختر عالم صاحب کی کتاب 'حقیقت محمدیہ ﷺ' سے ماخوذ ہے۔)

....

حجِ اکبر کا معنی و مفہوم

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

استاذ شعبہ علوم اسلامی جامعہ کراچی

واذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بری من المشرکین ورسولہ۔ (التوبہ ۳)

اللہ اور اسکے رسول کی جانب سے تمام لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن اعلان (عام) ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اسکا رسول بھی (ان کے عہد و پیمان سے بری الذمہ ہے)

قرآن مجید کا یہ واحد مقام ہے کہ جہاں حج کے لیے حج اکبر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ آیت مذکورہ مسلمانوں کے جس عظیم اجتماع میں پہلی مرتبہ پڑھ کر سنائی گئی وہ سن ۹ ہجری میں ادا ہونے والے پہلے حج کا عظیم الشان اجتماع تھا۔ جو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت میں ہوا تھا۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے اصلاً حج الاکبر کے الفاظ اسی محل کے لیئے مخصوص و مفہوم ہوئے۔ مطلب صاف ہے کہ حج اکبر کی تخصیص و تعیین کا انحصار جس محل پر موقوف ہوا۔ وہ یہی تھا۔ کیونکہ حج اکبر کا مورد اصلی بھی یہی حج تھا۔

پھر یہ حج نہ تو جمعہ کو واقع ہوا اور نہ ہی نویں ذوالحجہ کو۔ بلکہ یہ اصلاً دس ذوالقعدہ کو واقع ہوا۔ جسے نسی کے قاعدہ سے ذوالحجہ بنایا گیا تھا۔ عربوں میں قمری کیلنڈر کو آگے پیچھے کرنے کی رسم بد موجود تھی۔ یوں مکہ میں بیک وقت دو کیلنڈر جاری رہتے تھے ایک اصلی (یعنی قمری) اور دوسرا مصنوعی (یعنی نسی) تو نسی کیلنڈر کے حساب سے ۹ ہجری کا حج ۱۰ ذوالحجہ کو ہوا تھا۔ مگر قمری حساب سے وہ ۱۰ ذوالقعدہ میں واقع ہوا

تھا۔ (۱) اس لیئے جب ۱۰ ذوالحجہ ۱۰ ہجری کو رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا تو آپ نے اس امر کا اعلان بھی کیا کہ ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق السموٰت والارض السنۃ اثنا عشر شھرا منھا اربعۃ حرم ثلث متوالیات ذوالقعدہ و ذوالحجہ والمحرم ورجب مضر الذی بین جمادی الاخری وشعبان۔ (۲)

زمانہ اپنی اصل ہیئت میں گھوم کر آچکا ہے۔ جس ہیئت پر وہ اس دن تھا، جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا تھا، سال بارہ مہینے کا ہے۔ جن میں سے چار حرمت والے ہیں تین متواتر ہیں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم الحرام۔ چوتھا رجب ہے جو مضر قبیلے کا کہلاتا ہے اور یہ جمادی الاخریٰ اور شعبان کے مابین ہے۔

ہمارے ہاں حج اکبر کے سلسلے میں بالعموم جو بحث ملتی ہے وہ اپنے بنیادی مقدمے کے اعتبار سے ہی غلط ٹھہرتی ہے۔ جب یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حج اکبر کا تعلق اصلاً ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت والے حج سے ہے تو پھر اسے رسول اللہ ﷺ اور جمعہ کو زیر بحث لانا امر زائد ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ جو حج، جمعہ کو ہوتا ہے۔ اسے حج اکبر کہتے ہیں، غلط ہے یا وہ حج جو رسول اللہ ﷺ نے ادا کیا۔ وہ آپ کی وجہ سے حج اکبر ہوا۔ یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے اسلام کے پہلے حج کو حج اکبر کہا ہے۔ جس میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حج اکبر کا تعین یقینی طور پر ان ہر دو امور سے ہٹ کر ہے۔

ہمارے نزدیک حج اکبر سے کوئی مخصوص قسم کا حج مراد نہیں ہے بلکہ یہ ہر سال وقوع پذیر ہونے والے حج کا ہی نام ہے۔ اکبر کا لفظ کو تو حج اصغر یعنی عمرہ سے تقابل و امتیاز پیدا کرنے کے لیئے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے ھذا ھو الحج الاکبر لان العمرۃ تسمی الحج الاصغر، اور تفسیر روح المعانی نے اسی حقیقت کو بایں الفاظ ادا کیا ہے۔ ووصف بالحج بالاکبر لان العمرۃ تسمی الحج الاصغر۔ (۳)

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس وقت یوم الحج الاکبر والی آیت نازل ہوئی تھی تو کیا اس وقت سے ہی اس کا مفہوم یوم العرفہ یا یوم النحر یا یوم الجمعہ کے ساتھ ہر یکٹ ہو گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ یہ اضافی بحثیں یقیناً بعد میں پیدا ہوئیں کیونکہ یہ آیت اپنے وقت نزول سے ہی اپنی جو ہریت میں جس مفہوم کی حامل تھی۔ وہ فقط اتنی تھی کہ (چونکہ) مسلمانوں نے اب تک صرف عمرے ادا کیئے تھے۔ جسے وہ حج اصغر سے تعبیر کرتے تھے اور اب یہ پہلا موقع تھا کہ جس میں مسلمانوں کو حکم فرضیت کے بعد حج کی سعادت نصیب ہونے والی تھی۔ چنانچہ اسے حج اصغر سے ممتاز اور نمایاں کرنے کے لیئے حج اکبر کہا گیا۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حج الاکبر سے پہلے جو لفظ یوم آیا ہے اس سے مراد کوئی خاص دن لیئے

پر جو اصرار کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ لفظ یوم کی عدم معرفت ہے۔ یوم کا لفظ عام طور پر عربوں کے ہاں مطلق وقت اور زمانے کے لیئے بولا جاتا ہے۔ جو دن اور رات کی تحدید و تخصیص سے بالعموم آزاد ہوتا ہے۔ اس لیے گردش لیل ونہار کو یوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس تعریف کی رو سے یوم کا اطلاق جہاں کسی ایک دن پر کیا جاتا ہے وہیں ایک سال، ایک سو سال، ایک ہزار سال بلکہ پچاس ہزار سال پر بھی کیا جاتا ہے۔

تعرج الملئکة والروح الیه فی یوم کان مقدار خمسین الف سنه (المعارج/۴)

اسکی طرف فرشتے اور روح الامین عروج کرتے ہیں، ایک یوم میں جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہے۔

اور یوم کا لفظ بطور استعارہ کسی امر عظیم کے لیئے بھی بولا جاتا ہے اور اسکے معنی حکومت و سلطنت کے بھی آتے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں یوم کا لفظ ۳۴۹ مرتبہ آیا ہے۔ اور ہر جگہ اس کے معنی، اس دن کے نہیں ہیں جو چوبیس گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ لفظ جہاں کسی مخصوص وقت و حالت کے لیئے بولا جاتا ہے وہیں کسی خاص دور اور مرحلہ کے لیئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیت زیر بحث میں یوم کا لفظ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لیئے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں اسے یوم العرفہ یا یوم النحر کی کسی ایک اکائی میں محصور کر کے جمعہ کی شرط سے مشروط کرنا، اسکی وسعتوں کی محدود کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک یوم الحج الاکبر سے مراد اسلام کے اولین حج سے لیکر قیامت تک واقع ہونے والے تمام حجوں کا زمانہ ہے جسمیں اس اعلان کی تذکیر کا عملی سامان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے جسمیں فرمایا گیا تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے یعنی حج اکبر کا زمانہ کہ جسمیں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے منادی کردی گئی ہے۔ کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین مکہ سے بری الذمہ ہو چکا ہے۔

یہ اعلامیہ گو اولین حج کے موقع پر باقاعدہ، حکومتی اعلان کے طور پر سنایا گیا مگر روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی یوم اعلان کو تسلسل و دوام بھی بخشا۔

عن ابن عمر رضی اللہ تعالی عنه ان رسول اللہ ﷺ وقف یوم النحر بین الجمرات فی الحجة التی حج فقال ای یوم هذا؟ قالوا یوم النحر قال هذا یوم الحج الاکبر۔ (۳)

حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے حج ادا کیا تو یوم النحر (یعنی قربانی والے دن) جمرات کے درمیان کھڑے ہوئے اور صحابہ سے پوچھا کونسا دن ہے؟ انہوں نے کہا یوم النحر ہے آپ نے فرمایا یہ یوم حج اکبر ہے۔

یاد رہے کہ جس لمحہ موجود میں رسول اللہ ﷺ یہ ارشاد فرما رہے تھے وہ لمحہ ایام الاسبوع کے اعتبار سے ہفتہ کا دن تھا نہ کہ جمعہ کا۔

آپ ﷺ کا اسلام کے دوسرے اور اپنے پہلے اور آخری حج کے موقع پر اسے یوم الحج الاکبر سے تعبیر کرنا دراصل یوم کی وسعت کو ثابت کرتا ہے۔ نہ کہ اسکی محدودیت کو۔ اس لیئے ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ یوم کو یوم النحر یا یوم العرفہ میں مخصوص و مقید کرنا، یا اسے یوم الجمعہ سے مشروط کرنا، یوم حج اکبر کی آفاقیت کو محدود کرنے اور خود حج اکبر کے امتیازی وصف کو ختم کرنے کے مترادف ہے مزید برآں یہ کہ حج اکبر کو جمعہ کے ساتھ بریکٹ کرنے اور پھر اسے ستر حج کے برابر سمجھنے کی بحثیں، قرآن مجید کے تصور یوم الحج الاکبر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ تفسیر نعیمی، جلد دہم، ص ۱۵۱، مفتی احمد یار خان نعیمی، ناشر نعیمی کتب خانہ، مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات، سنہ اشاعت درج نہیں

۲۔ الجامع الصحیح للبخاری، امام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، باب نمبر ۵۰۲، رقم الحدیث ۱۷۷۳، ناشر فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور، طبع سوم ۲۰۰۰ء

۳۔ الجزء العاشر، ص ۴۷، مکتبہ امدادیہ ملتان، سنہ اشاعت درج نہیں

۴۔ تفسیر روح المعانی، ص ۴۶، الجزء العاشر، مکتبہ امدادیہ ملتان

....

بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے آیات وعلامات الٰھیہ

محمد اعظم سعیدی

مہتمم جامعہ اسلامیہ کورے وال، کراچی

سل بنی اسرائیل کم اتینھم من اٰیۃ بینۃ ومن یبدل نعمۃ اللہ من بعد ما جاءتہ فان اللہ شدید العقاب۔

ترجمہ: پوچھئے بنی اسرائیل سے کہ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دی تھیں اور جو اللہ کی نعمت کو حاصل ہوجانے کے بعد بدل دے، پس (ایسوں کو) اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (سورۃ بقرۃ:۲۱۱)

اس آیت میں مسلمانوں کو بنی اسرائیل کی تاریخ پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے اور بین السطور یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ بنی اسرائیل کے بادشاہوں، علماء کی گروہ بندیوں، اور ان کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیکر اس سے عبرت حاصل کریں اور ان جیسی صفات سے بچیں۔ اور یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جس کو نعمت مل جائے اور وہ اس نعمت کی ناقدری اور ناشکری کرے یا اسے بدل دے اور واضح دلائل ہوتے ہوئے راہ ہدایت کے بجائے گمراہی کا راستہ اختیار کرے یا رشد وہدایت کے ذرائع و اسباب کو غلط استعمال کرکے ان سے گمراہی اور فسق وفجور کا کام لے تو اسے اللہ تعالیٰ کی سخت گرفت سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق واضح ہوجانے کے بعد پھر بھی جو لوگ نہیں مانتے تو ان کا کیا حشر ہوتا ہے اور انہیں کتنے قسم کے عذابوں سے سابقہ پڑتا ہے یہ بنی اسرائیل کے علماء واحبار سے پوچھیے کہ ہم نے حق سمجھانے کے لئے ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو کتنی واضح دلائل اور نشانیاں دی تھیں، اور یہی دلائل ونشانیاں ان کی ہدایت کا سبب تھیں مگر انہوں نے ان اسباب ہدایت سے صراط مستقیم کے

بجائے ضلالت کی راہ اختیار کی نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ دلیلوں اور واضح نشانیوں میں غور نہ کرنا اور اسکی نعمتوں کی ناقدری وناشکری کرنا عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں آیت سے کیا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کیا کیا نشانیاں عطا فرمائی تھیں، مفسرین کے قول کے مطابق آیت سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں وہ دلائل اور وہ معجزات ہیں جو ان کی ہدایت کا سبب تھے مثلاً تورات یا تورات کی آیات، یا قرآن مجید، یا صحف موسیٰ یا زبور وانجیل ہیں یا وہ معجزات جو بنی اسرائیل کے طلب کرنے پر یا انہیں راہ ہدایت پر لانے کے لئے دکھائے گئے جیسے کمالات عصائے موسیٰ، یعنی عصا کا اژدھا بن کر جادوگروں کے سانپوں کو نگل جانا، دریا میں مارنے سے راستہ بن جانا پتھر پر مارنے سے بارہ چشمے جاری ہوجانا، ید بیضا (روشن ہاتھ) یا فرعون سمیت فرعونی لشکر کی غرقابی وغیرہ، یا بادل سے مینڈکوں کی بارش، یا خون اور جوؤں کی بارش، یا پہاڑ اکھڑنا، یا کوہ طور سے اللہ کا کلام سنانا وغیرہ وغیرہ مگر بنی اسرائیل یہ نشانیاں، یہ آیات بینات اور معجزات دیکھنے کے بعد بھی راہ ہدایت پر نہ آئے بلکہ مزید مطالبات کرتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہم اپنی آنکھوں سے اللہ کو نہ دیکھ لیں۔

نیز اسی آیت میں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ملنے کا اور پھر بنی اسرائیلیوں کی طرف سے ان نعمتوں کو بدلنے کا ذکر بھی ہے جس پر انہیں سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ نعمتوں کو بدل دینے سے کیا مراد ہے؟ یعنی کیا وہ پوری نعمت کو الٹ دیتے تھے یا اس میں ترمیم واضافہ کرتے تھے یا اس میں تنقیص وتحریف کرتے تھے۔ آیت میں لفظ یبدل استعمال ہوا ہے۔ الابدال والتبدیل والتبدل والاستبدال کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز کی جگہ رکھنے کے ہیں یہ عوض سے عام ہے کیونکہ عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لینا شرط ہوتا ہے لیکن تبدیل مطلق تغیر کو کہتے ہیں جیسے فبدل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لھم یعنی جو ظالم تھے انہوں نے اس لفظ کو جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا بدل کر اس کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا (مفردات راغب مترجم محمد عبدہ فیروزپوری ج ا ص ۷۶)

یبدل۔ تبدیل سے بنا ہے، بمعنی بدل دینا۔۔ کسی چیز کی حالت بدل دینے کو تغییر کہتے ہیں اور اصل بدل دینے کو تبدیل کہتے ہیں (تفسیر نعیمی بقرہ آیت ۲۱۱) تبدیلی نعمت چار طریقوں سے ہوتی ہے۔ (۱) نعمت کو سرے سے قبول ہی نہ کرنا۔ (۲) نعمت کو کھلے عام یا خفیہ طریقے سے بدل دینا۔ (۳) نعمت کے کچھ حصے کو باقی رہنے دیا اور کچھ حصے کو بدل دینا۔ (۴) نعمت کی قدر نہ کرنا یا اس نعمت پر شکر ادا نہ کرنا۔۔ بنی اسرائیل نے یہ چاروں حرکتیں کی تھیں جب کہ نعمت کی ناقدری وناشکری کرنا نعمت کے چھن جانے کا

سبب ہے لہٰذا انجام کار بنی اسرائیلیوں کی عزت وعظمت کو بھی خواری وذلت میں بدل دیا گیا۔ اب ہم مختصر طور پر ان میں سے چند نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے عطا فرمائی تھیں اور انہوں نے اسے بدل دیا جس پر وہ سزا کے حقدار ٹھہرے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے تورات نازل فرمائی مگر اس میں انہوں نے تحریف کی، اس کے احکام کی اتباع کے بجائے ان کو بدل ڈالا، حق باتوں کو چھپایا، اس سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے گمراہی کا راستہ اختیار کیا، چنانچہ اس جرم پر انہیں ذلت وشکست کی سزا بھگتنی پڑی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس پیغمبر بھیجے، بنی اسرائیلیوں نے ان پر ایمان لانے اور ان کی تعلیمات کو قبول کرنے کے بجائے ان کی تکذیب کی اور بعض پیغمبروں کو قتل بھی کیا، جس پر بطور سزا ان سے مصر کی سلطنت وحکمرانی چھین لی گئی اور انہیں دوسروں کا غلام بنا دیا گیا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا کلام سننے کی نعمت سے نوازا تو اسے تسلیم کرنے کے بجائے شبہات نکالے اور اللہ تعالیٰ کو واضح دیکھے بغیر ایمان لانے سے انکار کر دیا، جس پر وہ بطور سزا بجلی کی ایک کڑک سے ہلاک کر دیئے گئے۔

۴۔ ان پر من وسلویٰ نازل کیا گیا مگر وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے بجائے اسے بچا کر رکھنے لگے تو وہ سڑنے لگا، اور بلا مشقت روزی ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے کھانے کی نکتہ چینی کی، تو اس ناشکری پر من وسلویٰ روک کر انہیں بطور سزا کھیتی باڑی کی مصیبت میں مبتلا کر دیا گیا، من وسلویٰ کی جگہ ساگ پات اور فرصت کی جگہ انہیں رات دن مشغول کر دیا گیا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ حطة نغفر لکم کہتے ہوئے شہر میں داخل ہو جاؤ تو تمہیں بخش دیا جائیگا مگر انہوں نے لفظ کو ہی بدل دیا اور حنطة فی شعیرة کہتے ہوئے داخل ہوئے تو ان کو بطور سزا پھر سے شہر بدر کر دیا گیا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے دریائے نیل میں راستہ دے کر بنی اسرائیل کو فرعون کے لشکر سے نجات دی، فرعون کو لشکر سمیت غرق کیا مگر انہوں نے احسان ماننے کے بجائے اس احسان کی ناقدری کی، جس پر انہیں سزائے قتل دی گئی۔

۷۔ ان سے کہا گیا کہ یوم سبت یعنی ہفتے کے دن مچھلی کا شکار نہ کرنا مگر انہوں نے اس حکم میں تبدیلی کی یعنی شکار تو نہ کیا مگر ہفتے کے دن مچھلیوں کو تالابوں، حوضوں اور گڑھوں یا جوہڑوں میں جمع کیا تو بطور سزا انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔

۸۔ مسلسل نعمتوں کی ناشکری پر کوہ طور کو ان پر گرانے کے لئے معلق کیا گیا مگر پھر انہیں معاف کر دیا گیا۔

۹۔ بنی اسرائیلیوں کو یقین دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے معجزات دکھائے، پھر بھی انہوں نے انکار کیا۔

۱۰۔ وادی تیہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا، پر گرمی سے بچانے کے لئے ان بنی اسرائیلیوں پر بادلوں سے سایہ کیا گیا، اسی صحراء میں کتنی طریقوں سے انکی دستگیری کی مگر انہوں نے تمام نعمتوں اور دستگیریوں کی ناشکری کی۔

۱۱۔ نزول وحی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حضور خاتم الانبیاء علیہ الثناء والتحیہ پر ایمان لانے کی نعمت غیر مترقبہ عطا فرمائی مگر انہوں نے نعمت الٰہی یعنی ذات محمدیہ اور آپ کی نبوت پر ایمان نہ لاکر کفران نعمت کیا تو بطور سزا انہیں ملک بدر ہونا پڑا۔

۱۲۔ موجودہ بنی اسرائیلیوں سے پوچھیے کہ انہیں کتنی تعداد میں نشانیاں اور نعمتیں دی گئی تھیں ان کے پاس انہی میں سے تین ہزار سے زائد پیغمبر بھیجے، توریت، زبور، انجیل اور صحیفے دیئے، مگر ان ذرائع رشد وہدایت سے انہوں نے رہنمائی حاصل نہ کی، اپنے پیغمبر کا ساتھ دینے کے بجائے کہتے رہے فاذهب انت وربک فقاتلا انا ههنا قاعدون (یعنی اے پیغمبر آپ اور آپ کا رب جا کر جنگ لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں)۔

خلاصہ یہ کہ اس سے پہلے والی آیت میں بنی اسرائیل کی طرف سے عذاب کے انتظار کا ذکر تھا کہ وہ لوگ صرف یہ انتظار کر رہے ہیں کہ بادلوں کے سائبانوں سے عذاب لانے والے فرشتے اللہ کا عذاب لے کر ان کے پاس آ جائیں مگر بادلوں کے سائبانوں سے عذاب کا آنا حیران کن نہیں ہے۔ یہ بنی اسرائیل بادلوں میں اللہ تعالیٰ کی آیات وعلامات اور عذابات کا کئی بار مشاہدہ کر چکے ہیں اگر تمہیں یہ امر حیران کن معلوم ہوتا ہے تو بنی اسرائیلیوں سے پوچھ لو، وہ بادلوں کے سائبانوں میں بیشمار نشانیاں دیکھنے کا انکار نہیں کر سکتے۔

....

خواتین کی معاشی وسیاسی مصروفیات کے مضر پہلو

مریم ناز
رکن مجلس التفسیر

وہ نقصانات جو عورت کی ذات کو پہنچتے ہیں:

عورت کو اللہ نے خاندان اور گھر ہستی کی ذمہ داریوں کیلئے بنایا ہے، اس وجہ سے جب وہ اپنی اصل جگہ چھوڑ کر معاش اور سیاست کے جھگڑوں میں پڑتی ہے تو اسکو روحانی و مادی دونوں قسم کے ناقابل تلافی نقصانات پہنچتے ہیں۔ مثلاً:

(ا) کاروبار زندگی میں اسکو ایک ایسے حریف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس میدان کی بازیاں جیتنے کیلئے اس پر خلقی و فطری برتری رکھتا ہے۔ اس میدان میں مرد کی قوتیں اور قابلیتیں ٹھیک اسی طرح اسکے ساتھ تعاون کرتی ہیں جس طرح ایک مگرمچھ کی فطری صلاحیتیں سمندر کے اندر اسکے ساتھ تعاون کرتی ہیں۔ اسکے برعکس عورت کو ودیعت کردہ صلاحیتیں اس میدان میں اسکا ساتھ دینے کی بجائے مزاحمت کرتی ہیں جسکی وجہ سے بعض اوقات وہ خود کو بے بس محسوس کرتی ہے۔ حتیٰ کہ انتہائی جدوجہد کے باوجود بھی اپنے اس نقص کی تلافی کی کوئی راہ نہیں پاتی کیونکہ اس مقابلے میں مرد کی برتری اکتسابی (acquired) نہیں بلکہ فطری (inherent) ہے۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت اپنی بے بسی تسلیم کر کے بالآخر مرد کی ایک تابع مہمل بن کر رہ جاتی ہے اور اپنی شخصیت کو مرد کی شخصیت میں بالکل گم کر دیتی ہے یا پھر احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ہر بات میں مرد کی نقل کرنے لگ جاتی ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ نے عورت کو سنبھالنے والی، نگہداشت کرنے والی اور فیض پہنچانے والی بنایا ہے لیکن معیشت و سیاست کے میدان میں اسے مطالبہ کرنے سے لیکر ہڑتال، تخریب اور سارے دفتری ہنگاموں

میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ قدرت نے اسے مامتا کا جمال اور زوجیت کی محبوبیت بخشی ہے۔ اسکی مادرانہ شفقت اور محبت بھری مسکراہٹ اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی اور حیات بخش دولت ہے۔ لیکن اس میدان میں وہ مجبور ہوتی ہے کہ اپنے ان انمول جذبوں کو نمائشی مسکراہٹ اور ناز و انداز میں بدلے۔ بحیثیت ایک بیوی کے اسکی معیت و رفاقت، ہمارے نبی ﷺ کے الفاظ میں، اس دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ لیکن اس نئے مشغلے کے بعد ایک بیوی سے زیادہ وہ اپنے اندر ایک حریف اور مدِ مقابل کی خصوصیات جمع کر لیتی ہے۔ ان دونوں متقابل اوصاف کا موازنہ کر کے دیکھیے کہ دوسروں کے نفع نقصان سے قطع نظر خود عورت اپنی ذات کے نقطہ نظر سے یہ نفع کا سودا کرتی ہے یا نقصان کا؟

(ج) ایک خاتون اپنے فطری منصب کے لحاظ سے اپنے گھر کی حکمران ہے، اپنے شوہر کی عزت اور اسکی دولت میں شریک ہے اور عام طور پر ایک متوازن زندگی گزارنے والے خاندان میں شوہر بیوی کی اس سلطنت میں فطری طور پر مداخلت نہیں کرتا۔ جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو اسکی قیمت اسے اس سلطنت سے دستبرداری کی شکل میں چکانا پڑتی ہے۔

(د) گھر سے باہر عورت خواہ کتنی ہی کوشش کرے، اول تو اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے، اپنی بہت سی اعلیٰ خصوصیات سے محروم ہونے کے بعد بھی مرد کے مقابل فروتر ہی رہتی ہے، ثانیاً اس میدان میں اگر وہ کوئی خدمت سرانجام دیتی بھی ہے تو مرد کی طرف سے مشکل ہی سے اسکا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مرد پوری سچائی سے عورت کی قابلیت کا اعتراف کبھی نہیں کرتا۔ وہ پارلیمنٹ کے اندر بھی عورت کو ایک مدبر اور قانون دان کی حیثیت سے دیکھنے اور اسکی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کی داد دینے کے بجائے اسکے حسن و جمال، کپڑوں اور ان کے colors ہی کو دیکھتا ہے اور اگر کوئی داد دیتا بھی ہے تو اسی پہلو سے دیتا ہے۔ مرد کسی صورت میں عورت کی برتری تسلیم نہیں کرتا، پھر خواہ مخواہ اپنی نسوانیت داؤ پر لگانے کا فائدہ؟

وہ نقصانات جو خاندان اور معاشرے کو پہنچتے ہیں:

اگر مرد و عورت کے سماجی و معاشرتی رشتوں میں بے اعتدالی ہو تو معاشرہ زوال و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے کیونکہ سماجی رشتوں میں توازن نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے بعض شعبے خالی اور ویران ہونے لگتے ہیں اور بعض گوشوں پر ضرورت سے زیادہ قوت صرف ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں ہی باتیں معاشرہ کیلئے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ کسی بھی سیاسی و اجتماعی نظام کے اندر مرکزی نقطہ خاندان ہے۔ خاندان معاشرے کی ایک بنیادی اکائی اور یونٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظام زندگی چلانے کیلئے افراد خاندان یا گھر ہی مہیا کرتے ہیں۔ اگر اس بنیادی یونٹ کو

توڑ دیا جائے تو معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ خاندان سے معاشرہ اور معاشرے سے قوم وجود میں آتی ہے۔ اگر خاندان کا شیرازہ منتشر ہو جائے تو پورے ملک کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ خاندان کی اس اہمیت کی وجہ سے کسی بھی نظام میں سب سے زیادہ فکر اسکے تحفظ کی کیجاتی ہے کیونکہ اسکی حیثیت جڑ کی سی ہے اور اس کے تحفظ پر پورے نظام کے تحفظ کا انحصار ہوتا ہے۔

جس دور میں عورت خاندان کی تعمیر کو اپنا مقصد سمجھتی تھی وہ ہمارا سنہری دور کہلاتا تھا اور آج جب اس طبقے کو خواب غفلت نے آن گھیرا ہے تو قوم ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ گھر اور خاندان جن کی اہمیت کو آپ 'ترقی' کے جوش میں بھول گئے ہیں، دراصل وہ کارخانے ہیں جہاں انسان تیار ہوتے ہیں۔ یہ کارخانے جوتے اور کپڑے بنانے والے کارخانوں کی نسبت ترقی کیلئے کچھ کم ضروری تو نہیں! ان کارخانوں کیلئے جن صفات، نفسیات اور قابلیتوں کی ضرورت ہے وہ فطرت نے صرف عورت کو ہی دی ہیں۔ انکو چلانے کیلئے جن خدمات، محنتوں اور مشقتوں کی ضرورت ہوتی ہے، انکا زیادہ سے زیادہ بوجھ فطرت نے عورت ہی پر ڈالا ہے۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاندان کی تشکیل میں مرد اور عورت دونوں ہی حصہ لیتے ہیں، لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کام میں جو حصہ عورت کا ہے وہ حصہ مرد کا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ گھر یا خاندان کی اصل معمار عورت ہوتی ہے، مرد کا کردار تو صرف سامانِ تعمیر فراہم کرنے تک محدود ہے۔ عورت کی ماں کا جمال گھر کو رحم و محبت کی نورانیت سے منور کرتا ہے، رفیقِ زندگی کی حیثیت سے اسکی وفاداریاں اور جاں نثاریاں خاندان کو جوڑے رکھتی ہیں۔ اسکی آنکھوں کی ایک گردش میں جو معنیٰ مضمر ہوتے ہیں وہ ہزار ہا اوراق میں نہیں سما سکتے، وہ اپنی محبت بھری جھڑکیوں میں جو کچھ سکھا دیتی ہے وہ ہزار ہا معلموں کی محنت سے بھی نہیں سکھایا جا سکتا۔ دفتروں اور کارخانوں کیلئے آپ کو سینکڑوں آدمی مل سکتے ہیں لیکن گھر کے اندر عورت کے نہ ہونے سے جو خلا پیدا ہوگا اس کو پُر کرنے کیلئے خالقِ کائنات نے عورت کے سوا کسی کو پیدا ہی نہیں کیا۔ خدارا سوچیں! کیا آدم سازی اور جوتا سازی میں کوئی فرق نہیں؟ آدم سازی کے ان کارخانوں میں کرنے کے بہت کام ہیں۔ کوئی فرض شناسی کیساتھ ان کاموں کو کرنا چاہے، جیسا کہ انکا حق ہے، تو اسے سر کھجانے کی فرصت نہ ملے۔ انکو جتنی زیادہ قابلیت، سلیقے اور دانشمندی کیساتھ چلایا جائے اتنے ہی زیادہ اعلیٰ درجے کے انسان تیار ہو سکتے ہیں۔

گھریلو زندگی ایک مختصر اجتماعی زندگی کا نام ہے جس سے بڑے بڑے معاشروں کی بنیاد پڑتی ہے۔ جب تک خانگی نظام مضبوط نہ ہو معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ انسانی زندگی کے مختلف دور ہیں، بچپن سے

شروع ہو کر پیری پر ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان بے شمار سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ اسے ہر طرح کے حالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ بسا اوقات معاش کیلئے اسے سخت جدوجہد اور محنت کرنا پڑتی ہے، اپنی اور اپنے خاندان کی فلاح و بہبود اور ترقی کیلئے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں اسے سب سے زیادہ ضرورت ذہنی سکون اور اطمینان کی ہے۔ گھر اسے یہی سکون و راحت فراہم کرتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورت گھر کو راحت کدہ اور سکون کا مرکز بنا دے تاکہ گھر کے افراد اپنی ساری تکلیفیں اور پریشانیاں بھول کر اور تازہ دم ہو کر کشمکشِ حیات میں اپنا حصہ ادا کریں۔ اگر گھر کا ماحول خوشی و اطمینان اور آرام و آسائش والا ہوتا ہے تو گھر والوں کی زندگی پر قلبی لگاؤ، خلوص و سکون، اور اطمینان کا سایہ رہتا ہے۔ نسلِ انسانی کی صحیح تربیت اور پرورش کا دارومدار اسی پر ہے کہ گھر کے اندر کی فضا پرسکون ہو، اور ماں باپ کے باہمی تعلقات کسی قسم کے کھنچاؤ کا شکار نہ ہوں۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں ماں باپ میں باہمی ہم آہنگی کا فقدان ہو، اولاد کے اذہان بھی انتشار کا شکار ہوں گے اور وہ معاشرے میں بھی بے سکونی اور انتشار پھیلانے کا باعث ہونگے۔ یعنی کسی خاندان کی روحانی و اخلاقی اقدار جتنی محکم ہوں گی سعادت و خوش بختی بھی اتنی ہی ہوگی۔ مغربی مساواتِ مرد و زن کی تعبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ افراد کے مابین، خاندان میں محبت کم ہونے لگی، آپس میں پیار محبت کا خاتمہ ہونے لگا، زناکاری رواج پانے لگی، عورت کی توجہ جو صرف خاندان تک محدود تھی اور جسکا عشق بچوں کیلئے مخصوص تھا وہ ناپید ہو گیا کیونکہ جب خواتین خود کسبِ معاش کرنے لگیں تو اپنی محبت و توجہ کو صرف گھر تک محدود کرنے پر قادر نہ رہیں۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بچے کیلئے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی دوسری غذا نہیں ہے۔ اگر ماں گھر پر نہ رہے اور باہر کی مصروفیات اسے دن بھر گھیرے رہیں تو وہ اسکا اہتمام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح شیر خوارگی کی عمر میں اور اسکے بعد بھی ایک عرصے تک بچے کی صحیح پرورش ماں ہی کے ہاتھوں میں ہو سکتی ہے۔ بچے کی صحیح نشوونما کیلئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ اسے مناسب اور متوازن غذا ملتی رہے بلکہ اس کیلئے محبت، ہمدردی اور ممتا کی بھی ضرورت ہے۔ اگر اسے اپنے قریب ترین ماحول میں یہ جذبات نہ ملیں تو اسکی شخصیت مرجھا جائے گی اور ابھرے گی تو بالکل غلط رُخ پر ابھرے گی۔ ان جذبات کا مخزن ماں ہی کا سینہ ہے۔ کوئی بھی دوسرا شخص اسکا بدل نہیں بن سکتا۔ جب ماں دن بھر گھر سے باہر رہے گی تو بچہ ان جذبات کیلئے ترستا رہے گا اور وہ اسے نہ مل سکیں گے۔ خود سوچئے کہ جب یہ صورتحال ہوگی تو نئی نسل جو ملک کا نظام سنبھالنے کیلئے تیار ہوگی وہ کیسی ہوگی؟ جبکہ وہ ہر مشکل کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو جانے والی ہستی، ماں کی تربیت اور محبت کی کمی میں پرورش پائے گی۔ ہمیں آنے والے کل کی تباہی کو روکنے کیلئے مغربی

ایجنڈے کے نفاذ کو روکنا ہوگا۔ آج مہذب ترین معاشروں میں کثرت طلاق ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے۔ اس بات پر بہت سے لوگ متفق ہیں کہ طلاق کی بنیادی وجہ خواتین کا گھر سے باہر کام کرنا ہے۔ گھریلو آمدنی کی قلت یا کسی اور وجہ سے جو شادی شدہ خواتین گھر سے باہر کام کاج کرتی ہیں ان میں سے اکثر صاحب اولاد ہیں۔ گھر سے باہر ملازمت کرنا اور گھر کے اندر امور خانہ داری اور بچوں کی پرورش کرنا خواتین کے اعصاب کو اس حد تک متاثر کر دیتا ہے کہ عموماً شوہر و زوجہ کے مابین مستقل اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور اسکا نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ طلاق کی کثرت کسی بھی معاشرے کی بقاء و ترقی کیلئے بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ایک ریسرچ کے مطابق وہ بچے جن کی والدین طلاق یافتہ ہوں ان میں سے 70% آئندہ آنے والی اپنی عملی زندگی میں اسی عمل کی وجہ سے خوفزدہ رہتے ہیں اور انکی ازدواجی زندگی بے حد متاثر ہوتی ہے کیونکہ اس رشتے کی ناپائیداری کا خوف انہیں ساری زندگی کشمکش میں ڈالے رکھتا ہے۔ (۱) خاندانی بقاء کیلئے ضروری ہے کہ معاشرہ پھر سے اسلامی دستور کا پابند ہو۔

آیئے آپ کو روس و امریکہ کے تجربات سے استفادہ کرواتے ہیں۔ اشتراکی نظام نے خاندانی نظام کے تصور کو ہی ختم کر دیا تھا۔ عورت اور بچے ریاست کی ملک سمجھے جاتے تھے۔ تمام مردوں اور خواتین پر کام کرنا لازم تھا اور جب دو مختلف شہروں میں کام ہونے کی صورت میں کچھ شوہروں اور بیویوں کو مشکلات پیش آئیں تو لیبر بورڈ نے اسکا حل یہ نکالا کہ میاں اور بیوی دونوں اپنی اپنی جگہ نئے چاہیں میاں اور بیوی بنا لیں۔ اسکے ساتھ ساتھ جائز اور ناجائز بچوں کو تمام حیثیتوں سے برابر قرار دے دیا گیا۔ عورتوں کی سہولت کیلئے سرکاری سرپرستی میں حمل گرانے کے مراکز قائم کر دیے گئے۔ ان باتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ چند ہی سالوں میں لاوارث اور آوارہ بچے گلی کوچوں میں پھرنے اور چوری، مار پیٹ اور قتل تک کی وارداتیں کرنے لگے۔ 1934 کے اعداد و شمار کے مطابق صرف ماسکو میں ستاون ہزار ولادتوں کے مقابلے میں ایک لاکھ چوّن ہزار حمل گرائے گئے۔ معاشرے میں طلاق کی کثرت ہوگئی۔ عورت کی آزادی کے یہ شاندار نتائج جب سامنے آئے تو اشتراکیوں کی آنکھیں کھلیں۔ جس طرح اس سے پہلے لینن کو کچھ عرصہ تک فطرت سے لڑنے کے بعد یہ معلوم ہوا تھا کہ ملکیت ذاتی کی کامل نفی کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو بھوکا مار دیا جائے اسی طرح ان ہولناکیوں کو دیکھنے کے بعد اس کے جانشینوں پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ گھر اور خاندان کی بربادی خود قوم اور ملک کی بربادی ہے۔ چنانچہ اسکے بعد انہوں نے یکلخت پینترا بدلا۔

1936 میں ماہرین قوانین و عمرانیات کے کمیشن کے صدر Stolz نے درج ذیل سفارشات تیار کیں:

(1) نکاح ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اب تک طلاق بہت سہل رہی ہے، ضرورت ہے کہ آئندہ اسے دشوار بنایا جائے۔

(2) ایک سوشلسٹ ملک میں اسقاط حمل کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(3) اشتراکی عورت بلاشبہ مرد کی ہم رتبہ ہے لیکن وہ اس عظیم فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی جو قدرت نے اس پر عائد کیا ہے، یعنی ماں بننے کا فرض۔ اسکی زندگی دوہری اہمیت رکھتی ہے، ایک اسکی شخصی حیثیت سے دوسری ماں ہونے کی حیثیت سے۔

اسکے بعد رشتہ نکاح اور خاندان کے استحکام کیلئے اشتراکیوں نے جو قوانین نافذ کئے اور جو اصلاحات کیں وہ یہ ہیں:

(1) پوسٹ کارڈز کے ذریعہ طلاق دینے کا طریقہ منسوخ کر دیا گیا۔

(2) طلاق پر فیس عائد کر دی گئی جس کی شرح 2000 روبل تک تھی۔

(3) طلاق کو قابل نفرت بنانے کیلئے طلاق دینے والے اشخاص کے پاسپورٹوں پر بھی ان کی اس خصلت اور انکی طلاقوں کی تعداد کا اظہار ضروری سمجھا گیا۔

(4) جائز اور ناجائز بچوں کے درمیان فرق کو بحال کر دیا گیا۔

(5) اسقاط حمل کو قتل کا ہم معنی جرم قرار دیا گیا، یہاں تک کہ اسکا مشورہ دینے والے کیلئے بھی دو سال قید کی سزا رکھی گئی۔

(6) غیر شادی شدہ خواتین و حضرات اور تین سے کم بچوں والے والدین پر ٹیکس عائد کر دیا گیا۔

(7) بچوں کی پیدائش کی ترغیب دینے کیلئے عورت کو زچگی کے دنوں میں رعائتیں اور سہولتیں بہم پہنچانے کا اور بچوں کیلئے وظائف کا طریقہ مقرر کیا گیا۔

(8) جن بچوں کو پہلے والدین کے خلاف جاسوسی پر اکسایا جاتا تھا اب انکو یہ تعلیم دی جانے لگی کہ بچوں کو اپنے ماں باپ سے محبت اور انکی عزت کرنی چاہیے اگرچہ وہ پرانی وضع کے ہوں اور بچوں کی اشتراکی لیگ سے نفرت بھی کرتے ہوں۔ (۲)

روسی صدر میخائل گورباچوف کے زمانے میں 'پریسٹرائیکا' کا بہت چرچا ہوا تھا۔ اس نے صاف اور واضح الفاظ میں لکھا:

'ہماری مغرب کی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا اور اسکو گھر سے باہر نکالنے کے نتیجے میں بے شک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کئے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا اسلئے کہ مرد بھی